

مقالات

صلاح و فساد

از جناب محمد زبیر صاحب رازیم تالے

مقامات :-

EPICUREANISM

۱ - عیش یا خوشی

UTILITARIANISM

ب - افادیت

QUALITY OF PLEASURE ج - جان اسوارٹ بل کا عیش کی نوعیت کا نظریہ

OBJECTIVITY OF GOOD

د - نیکی کا معروضی نظریہ
یا حصارِ جہی تصور

۴ - قرآن حکیم

۵

تم بدی اور غم دونوں سے بھاگتے ہو۔ اس لیے یہ دونوں ہمارے موضوع سے خارج ہوئے مگر خوشی اور کھلائی آپم ان دونوں کو اپنے دامن میں سمیٹ لینا چاہتے ہو۔ صبح و شام ان کے لیے پتھر پھرتے ہو پھر اُسے کیا کہو گے جو تمہیں ان کے مساکن کو جانے والی سیدھی اور قریب کی راہ سے آشنا کر دے؟

جس منزل کی راہ پوچھتے ہو پہلے اُسے متعین کر لو اس لیے کہ یہ مسافر کا اپنا فرض ہے۔ میں

کدھر جاؤں؟ کیسی سے نہیں پوچھا کرتے۔ جدھر جانا چاہتا ہوں اس کا راستہ کونسا ہے؟
یہ البتہ پوچھنے کے قابل بات ہے۔

۱۔ کیا خوشی تمہیں دکھ اور نقصان پہنچاتی ہے؟ — ایسا ہونا تو تم اُسے
ڈھونڈتے کیوں؟

۲۔ نقصان نہیں تو کیا فائدہ اور بھلا ہوتا ہے؟ — تیسری تو کوئی صورت
ہی نہیں۔

۳۔ خوشی پھر بھلائی بخیر ہے۔ تمہارے لیے سو مند اور بہتر ثابت ہوئی۔ — یقیناً
تمہاری منزل پھر صرف خوشی ہوئی۔ خوشی اور بھلائی، الفاظ دو تھے، مگر اصل مفہوم صرف
خوشی نکلی۔ حقیقت حال کا فیصلہ پھر دہرا لو۔ "خوشی میں نقصان ہونا تو تم اسے نہ ڈھونڈ
اور نہ قبول کرتے" زندگی کے سارے ایام تمہارے سامنے کھلے ہیں۔ انہیں غور سے دیکھ
جاؤ۔ کیا وہ تمہارے اس فیصلہ کی تصدیق کرتے ہیں؟

بچوں نے اُسے مٹی کے گھروندوں میں ڈھونڈا اور پایا۔ مگر جب ان کی خوشی کی جگہ بھوک،
ذات کی تاریکی اور نیکان کی غلش نے لے لی تو وہ گھروں کو پلٹ آئے۔ اُسی خوشی کو پھر انہوں نے
کھانے اور سونے میں تلاش کیا۔ کھانے میں کنین کی تلخی اور لیستر پرکاتوں کی چھین ہوتی تو وہ
نہ کھاتے نہ بیٹھتے۔

حیوانات کو اسی کی جستجو ہے۔ ہرن سبزہ زاروں میں چوکڑیاں بھرتا دور نکل گیا ہے، گلہاس
کے دل سے پوچھو کہ شکاری کتوں کا غم آفریں تصور سبھی اُسے کس قدر بار بار پورٹا ہے۔

نیک آدمی کو دیکھو وہ اپنی نیک عملی کی زندگی میں لطف اٹھا رہا ہے اور خوش ہے
تو پھر یہ کیوں نہ کہا جائے کہ خوشی، مسرت و یا عیش، نیکی ہے؟

۳۵۵ ق-م میں یونانی حکیم اپیکورس (EPICURUS) نے حصولِ مسرت کو ہی انسان کے فعل کی غایت اغایات بتایا۔ مسرت کا حاصل کرنا، زندگی کو عیش و لذت میں کاٹ لینا اُس کے پیروں اور اس کے اپنے نزدیک سب سے بڑی بھلائی ہے۔ یہی ایک محدود ہے جس کے گرد ہماری ساری زندگی گردش کرتی ہے۔ صرف انسان کی نہیں بلکہ حیوان اور دوسری مخلوقات کی بھی۔ ایک آرزو ہے جو اس کا رضاءِ حیات کو آباد رکھے چلے آ رہی ہے، اور وہ صرف لذت کے حصول کی آرزو ہے۔ وہ دلیل لاتے ہیں کہ صرف لذت اور خوشی کے ایک عنصر کو حیاتِ ارضی سے نکال دو تو زمین پر بسنے والی مخلوقات کی ساری کارگاہیں سرور و نجاتیں گئی۔ پس انسان کافرنا صرف ایک ہے اور وہ خوشی کا حاصل کرنا ہے۔ خوشی نیکی ہے، بھلائی ہے، پس وہ جس قدر ہو بے حد ہو، اچھی ہے۔

اب زندگی کی طرف لوٹو اور دیکھو کہ تنخواہ و نطائر تمہارے اس فیصلہ کا کہاں تک ساتھ دیتے ہیں۔

۱۔ تمہارے خزانے سونے اور چاندی سے پر ہیں۔ تمہارے ہاں آخر عمر میں بچہ پیدا ہوا ہے۔ احباب کی دعوت پر روپیہ صرف کرتے ہو تو خوشی ہوتی ہے۔ اپنی نمود خود آپ دیکھتے ہو تو خوشی حاصل ہوتی ہے۔ نم نے خزانوں کے منہ چنانچہ کھول دیئے اور جو تھا اُٹا دیا۔ اب اسی بستی میں کچھول لے کر گدائی کرتے ہو۔ تو پھر کیا خوشی بھلائی ہے؟

۲۔ عیش پرستیاں تمہیں اتنی دور لے گئی ہیں کہ تم جسمانی طور پر معذور ہو کر اپنی زندگی سے بیزار ہو گئے ہو۔ تو کیا پھر خوشی بھلائی ہے؟

۳۔ سارا گاؤں چوروں کی بستی ہے۔ انہیں چوری میں مسرت حاصل ہوتی ہے۔ باہم کسی کو نہیں چھوڑتے کسی کے ہاتھ سے کسی کی عصمت محفوظ نہیں۔ تم بھی چور ہو۔ آج تمہارا سارا اندوختہ بھی

لوٹ دیا گیا اور تمہاری حالت یہ ہے کہ اپنا بچ اور اندھے ہو چکے ہو چو کہو تمہارے گھر سے بہت بڑا خزانہ ہاتھ لگا ہے مگر تم بتاؤ کہ یہ کارخانہ حیات کیا مسرت کے محور پر گھوم رہا ہے ؟
تم کہو گے، نہیں۔ اس لیے زندگی کے مذہبِ عمل کی تلاش کسی اور گوشہ میں کرنی چاہیے۔

تمہارا فیصلہ تمہارے جسم و جان کے ایک ایک ریشے کی صدائے حال ہے۔ اور یہ صرف تمہارا اور تمہارے عہد کا فیصلہ ہی نہیں ہے بلکہ آغازِ آفرینش سے اب تک افراد اور قومیں اسی ایک نتیجہ پر پہنچی چلی آئی ہیں۔ اگر تم دورِ سچے ماضی کے تاریک پردوں میں جھانک سکتے ہو تو اقوامِ عالم کی سرگزشتوں کے سراغ کو نکلو تم اسی ایک نتیجہ پر پہنچو گے جو تمہارے سامنے مزب ہو رہا ہے۔ تم ہر عہد میں کتنی ہی ایسی بستیاں پاؤ گے، کتنے ایسے افراد اور کتنی ہی ایسی قومیں دیکھو گے جو عیش و عشرت میں غرق ہیں جن کی زندگیاں صرف عیش پرستیوں کے لیے ہو کر رہ گئی ہیں۔ پھر جب عشرت کی سرستیاں اُن کے لیے دردناک انجام لے کر آئیں تو شدتِ دہشت و حیرت سے اُن کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں اور پھر اُن کے لب و دہن سے جو پکار بلند ہوئی وہ اس کے سوا کچھ نہ تھی افسوس ہم پر، ہم انجام کی اس ہونناک ٹھڑی سے غفلت میں رہے، بلکہ ہم خود اپنی جانوں پر ظلم و شرارت کرتے رہے۔ آخر وہ اپنی بستیاں چھوڑ کر بھاگے :-

فَلَمَّا أَحْسَبُوا أَن بَأْسَنَا إِذَا هُمْ مِنْهَا يَرْكَبُونَ ۝

”جب ہمارا مذا ب انہوں نے محسوس کیا تو دیکھو اچانک وہ بستنیوں سے بھاگے جا رہے ہیں

لَا تَنْزَلْنَاهُمْ وَلَا رَجَعْنَاهُمْ إِلَىٰ مَا آتَيْنَاهُمْ فِيهِ مِن دُونِ مَا لَهُمْ فَسُخْرُونَ ۝

اب بھاگتے کہاں ہو، اپنے اسی عیش و عشرت کی طون ٹون جس نے ہمیں اس قدر تیار کر رکھا تھا، انہی مکانوں میں

واپس جاؤ جبکہ مضبوطی کا تمہیں غرہ تھا، شاید وہاں تباہی و تشرہ میں تمہاری منزلت ہو تو تم سے کچھ ریاضت کیا جا

قَالُوا يَا وَيْلَنَا إِنَّا كُنَّا ظَالِمِينَ ۝ (الانبیاء: ۱۱، ۱۲، ۱۳)

”انہوں نے کہا ہم پر افسوس ہم ظالم تھے“

ایسی کورس کے پیروں نے بھی اسے محسوس کیا۔ چنانچہ وہ ایک قدم اٹھا کر آگے بڑھے اور کہا کہ زندگی کی ننگ و دو کا مرکز ہے تو خوشی ہی مگر اس کی دو صورتوں میں انسان کے لیے امتیاز کرنا لازماً ہے پہلی صورت ان مسرتوں کی ہے جو عارضی ہوتی ہیں، اسی تھیں اب مٹ گئیں۔ دوسری قسم کی وہ مسرتیں ہیں جو دیرپا ہیں۔ وہ خوشی جو شدید جذبات اور جوش مثلاً عشق اور غصہ کی بندگی سے حاصل ہوتی ہے، پہلی قسم کی عارضی خوشی ہے۔ اس سے روح کو نسبتاً دکھ زیادہ پہنچ جاتا ہے۔ آرام، سکون، امن، احساسات سے کنارہ گیری، یہ دوسری نوع کی مسرتیں ہیں اور دیرپا ہیں اس لئے بہتر ہیں، ایسی حالت کی چنانچہ تلاش کرنی چاہیے جہاں کوئی چیز کسی حال اور کسی وقت انسان کو رنجیدہ نہ کر سکے۔

اب آؤ اسے ایک نقاد کی نظر سے دیکھیں۔ کیا یہ ایک بن باسی جوگی کی زندگی نہیں ہے جو جہد حیات سے کنارہ کش ہو کر سستی سے دور نکل جاٹے؟ وہاں بھی اُسے اگر صبح و شام کے کھانے کی فکر رنجیدہ کرتی ہو، وہاں بھی اگر روزندوں سے اُس کا دل دہلتا ہو، تو وہ اس کے سوا اور کیا چارہ گا پائے گا کہ زمین و آسمان کے درمیان کوئی مسکن تلاش کرے یا خود کشتی کر لے۔ کیونکہ بن باسی کی زندگی بھی اس کے موافق نہیں ملتی۔ چنانچہ ایسی کورس کے پیروں کا ایک فرقہ اس طرٹن گیا ہے کہ خود کشتی بہتر بن بھلائی ہے اور جو انتہائی مسرت چاہے وہ اپنے حلقوم پر چھری رکھے اور خود کشتی کر لے تاریخ نے اس گروہ کے خود کشتی کرنے والوں کے نام محفوظ رکھے ہیں۔ تو پھر کیا خوشی کے حصول کے گرد انسان کی زندگی اور زندگی کے جملہ مطالبات اور فرائض کو مرتب کیا جاسکتا ہے؟

ظاہر ہے کہ نہیں۔

ب

افلاطون نے تھیٹیس (THEAETUS) میں ثابت کیا ہے کہ اگر عقل سے الگ ہو کر کوئی مسرت کا تعاقب کرنا چاہے گا تو نوٹے میں رہے گا اور اُسے نہیں پائے گا عقل اور فہم سے الگ ہو جانا اس کے نزدیک ایک ہی وقت میں اپنے محافظ سے الگ ہو جانا ہے، مستقبل اور ماضی سے کٹ جانا ہے۔ مستقبل کی خوشیوں کا انتظار اور تیاری، ماضی کی خوشیوں کی یاد اور لذت، بھلا عقل کو تیاگ کر خوش رہنا چاہے وہ سوچے گا کیوں؟ کل وہ اسی ماں کا بیٹا تھا۔ وہ اسے یاد رکھے تو کیوں؟ اس کے فرائض کو ادا کرے تو کیوں؟ افلاطون کا مقام اسی حکیم کے قریب نظر آتا ہے، اس نے کہا:-

سچی اور جھوٹی خوشی میں امتیاز کرو۔

آسودہ اور پاک خوشی میں فرق کرو۔

شریف اور ضعیف میں فرق جانو۔

افلاطون کے نتائج فکر سے آگے بنتھم (JEREMY BENTHAM 1748-1852) کی کیریئر شروع

ہوتی ہے۔ اس نے ریاضی کے ٹھوس اور محسوس اصول پر مسرت کے اس فلسفہ کو بحول کیا اور یہاں اس کی ایک عملی صورت نکالی۔ اس کی تفصیل کو سمجھ لو۔

ہمارے سامنے مسرت ایگر مشاغل کی ایک فہرست آگئی ہے جو ان کی اٹھان اور جذبات کے طوفان کا مطالبہ یہ ہے کہ ساری عشقیں اپنے دامن میں لپیٹ لی جائیں۔ اور دل نے یہ کہہ دیا ہے کہ لطف اندوزی ہی جب مدعا حیات ہے تو یکبارگی ایک ہی فرصت میں سب کو دیوانہ وار شروع کر دیا جائے۔ مگر افلاطون نے متنبہ کر دیا ہے کہ یوں عقل و فہم سے جدا ہو کر خوشی کے نقاب میں نکلو گے تو گھٹائے میں رہو گے۔ اس لیے تمہارا طبعی کاریہ ہونا چاہیے کہ ساری فہرست میں سے پسندیدہ خوشی کا انتخاب کرو۔ اب سوال یہ ہوا کہ یہ کیسے کریں؟

بینتھم کتا ہے کہ جس طرح تم ریاضی کے اعداد کو جمع کر لیتے ہو اور پھر ایک صحیح نتیجہ اخذ کر کے مطمئن ہو جاتے ہو، ٹھیک اسی طریق چستی مستری تمہیں اپنی طرف بلارہی ہیں ان پر ذیل کے چار گوشوں سے نگاہ ڈالو اور نتائج کو ایک جگہ جمع کر لو۔ ایسا نہ ہو کہ انہوں نے تمہیں بلایا اور تم دلیانے ہو کر دوڑ گئے۔

چار گوشے :-

- ۱۔ کیا اس کام سے یقینی طور پر خوشی حاصل ہوگی یا یہ غیر یقینی آرزو ہے ؟
 - ۲۔ کیا یہ خوشی جو حاصل ہونے والی ہے غم کی ہرگز آدوگی سے پاک اور صاف ہے ؟ یعنی اس میں کوئی ایسا پسو تو نہیں جو سامنے آکر ہماری عشرت کو ملد کر دے ؟
 - ۳۔ کیا یہ دیر پا ہوگی یا جلدی مٹ جانے والی ہے ؟
 - ۴۔ حاصل ہونے والی خوشی کی مقدار کس قدر ہے ؟ بے کراں ہے یا تھوڑی سی ؟
- اب اگر اس تحقیق کے نتائج کا مطالعہ تمہارے حق میں ہے تو بس جو سبھی عشرت تمہارے سامنے آگئی ہے گزردو، وہ تمہارے لیے بھلائی ہے۔ اپنی اس شکل میں زندگی کا یہ افادی نظمیہ ہے
- (PHILOSOPHY OF UTILITY)۔ کام صرف وہ کرو جس میں سب سے کم زحمت اٹھانی پڑے اور سب سے زیادہ عیش کی مقدار ملے۔ یہی نیکی ہے۔ یعنی نیکی تمہارا ایک ذاتی اور انفرادی انتخاب ہے۔ تمہارا ذاتی رجحان ہے۔ اصطلاحی زبان میں نیکی کی حیثیت مضموعی یا داخلی (SUBJECTIVE POSITION) ہے۔ تمہارے اپنے اندر کی آواز اور ذاتی میلان کے ماتحت اس کی شکل بدلتی رہتی ہے۔

ابھی یہ مقام اپنی پوری کیفیت اور مطالبات کی رو سے شاید واضح نہ ہوا ہو اس لیے رک جاؤ تاکہ اسے کھول کر تمہارے سامنے رکھ دیا جائے۔ چند سطروں پر لکھ کر پھر بیٹھ کر ان چار معیاری اصولوں پر سوچ جاؤ۔ وہ یہ ہیں :-

۱۔ خوشی یقینی ہے یا غیر یقینی ؟

۲- اس میں غم کی کوئی آلودگی تو نہیں ہے

۳- وہ دیر پا ہے یا عارضی؟

۴- زیادہ ہے یا تھوڑی؟

اب انہی معیاروں کو سامنے رکھ کر دیکھو۔ ایک عورت بادشاہ وقت کی بیوی ہے۔ جوان ہے۔ نہایت خوبصورت ہے۔ دولت کی اس کے پاس کمی نہیں۔ وہ اپنے غلام پر عاشق ہو جاتی ہے۔ اپنے عظیم الشان محل کے ایک ایسے اندرونی حصہ میں جہاں کسی راز کے کھلنے کا اندیشہ نہیں اس غلام کو طلب کرتی ہے اور اپنے مطالبات جنسی اس کے سامنے پیش کر دیتی ہے۔ دولت، حسن، جوانی، اور عیش جاودانی سب اس غلام کے قدموں میں ہیں اور ملکہ کی شفقتی، اس کی دانشمندی اور اس کا اپنا مفاد، ہر چیز اس امر کی ضمانت دے رہی ہے کہ اس کا مطالبہ قبول کر لینے میں غلام کے لئے نئے ہی مزے ہیں۔

اب غور کرو۔ (۱) غلام کے لئے خوشی یقینی ہے۔ کسی شک کی اس میں گنجائش ہی نہیں۔ (۲) اس عیش میں غم کی کوئی آلودگی نہیں۔ وہ ملکہ کی حفاظت میں ہے اور ملکہ کا اپنا مفاد یہ چاہتا ہے کہ راز کھلنے نہ پائے۔ البتہ اس کی خواہش رُذکر دینے میں جان تک کا خطرہ ہے۔ (۳) ملکہ اس پر ہزرا جان سے فدا ہے، اس لیے یقینی ہے کہ جیتے ہی غلام کے پاؤں دھو دھو کر پتی رہے گی۔ (۴) خوشی کی مقدار بے حد حساب ہے۔ ایک غلام اور ملکہ وقت اس کے قابو میں ہو۔ مال بھی، جمال بھی، عیش و محبت بھی، اور حکومت و اقتدار بھی۔ اس خوشی میں آخر کس چیز کی کمی ہے۔

دیکھو چاروں معیار پورے ہو رہے ہیں۔ سنیقہم کی افادیت کا صاف صاف مشورہ یہ ہے کہ غلام کو اپنے جسم و جان کی پوری قوت کے ساتھ، اپنے دامن طلب کو پورا پھیلانے اور اس خوشی کو عیش لینا چاہیے۔ نادان ہو گا اگر اس موقع کو ہاتھ سے دے گا۔

بینتھم کے نزدیک ایسی خوشیاں نیکیاں ہیں اور ابن آدم پر ان کی تلاش فرض ہو چکی ہے۔ جو مثال ہم نے دی ہے اس نوعیت کی مثالیں عام نہیں تو نہ ہوں، نایاب نہیں ہیں۔ کیا ایک چو کو ایسے مواقع بہم نہیں پہنچ سکتے جن میں بینتھم کے چاروں معیار پورے ہوتے ہوں؟ کیا بہت سے رشوت خوار حاکم ہماری آنکھوں کے سامنے یقینی، بے غم، دیر پا اور بے حساب خوشی جمع نہیں کر رہے ہیں؟

یہ ہمیں ماننا پڑے گا کہ اسپکیورس کے اندھے عیث پرست سے افلاطون اور بینتھم کا دانا عیث پرست بہتر ہے جو چوری، زنا اور جھوٹ کا مرتکب ہونے سے پہلے موقع دیکھ لیتا ہے۔ مگر جس بات پر دونوں متفق ہیں وہ یہ ہے کہ انسان کے لئے اُس کی اپنے انفرادی صواب و دید سے الگ نیکی کا کوئی دستور نہیں جسے تم اچھائی سمجھتے ہو لازم نہیں کہ تمہارے دوست بھی سمجھیں، لازم نہیں کہ تمہاری نیکی سلع کے لیے بھی نیکی ہو۔

بینتھم کا پیرو رحمدل ہو سکتا ہے، کیونکہ وہ دانا ہے اور افادیت کا مطالبہ یہ ہے کہ جب کل اُس پر مصائب کا پہاڑ ٹوٹے گا تو کوئی اُس پر رحم کرے گا۔ وہ تمہارا دوست ہو سکتا ہے، مگر اس امید پر کہ جب وہ آلام میں گھر جائے گا تو تم دوستی کر دو گے۔ وہ اپنا عہد اس لیے استوار رکھتا ہے کہ دوسرے اس سے بد عہدی نہ کریں۔

اس قسم کی سیرت کیا انسان کے لیے موزوں ہے؟ تم پکار اٹھو گے کہ نہیں۔ اخلاقیات کے مفکرین بھی تمہارے ساتھ ہمزبان ہیں، مگر وہ دو گروہوں میں بٹ جاتے ہیں۔

پہلا گروہ جان اسٹوارٹ مل (John Stuart Mill) کا پیرو ہے جس نے خوشی کی نوعیت کو انتہائی و عمل کا معیار قرار دیا۔

دوسرا گروہ کانٹ (Kant) کی سرکردگی میں نکلتا ہے اور نیکی کا ایک خارجی یا معروضی وجود

(OBJECTIVE ENTITY OF GOODS) تسلیم کرتا ہے۔ کلیسائی مفکرین کی حمايت اس کے ساتھ ہے۔

ج

جان سٹوارٹ مل کتا ہے کہ تم اپنی تاجرانہ زندگی کے پورے پھیلاؤ کو اگر غور سے دیکھ سکو تو تمہیں نظر آئے گا کہ اس میں تم بچھیم کی طرح صرف یہ نہیں دیکھتے کہ تم اپنے داموں سے زیادہ سے زیادہ کون سا سامان خرید سکتے ہو۔ بلکہ تم یہ بھی سوچتے ہو کہ سامان تھوڑا ہو تو ہو مگر بذات خود اچھا ہو تم صرف (QUANTITY) کیت ہی نہیں بلکہ کیفیت (QUALITY) بھی دیکھتے ہو۔ لہذا بچھیم نے ہمیں جو یہ بتایا تھا کہ نتائج کو جمع کر لو اور پھر تعداد دیکھ لو کہ وہ کم تو نہیں، مسرت کے انتخاب کا یہ طریقہ صحیح نہ ہوا۔ بلکہ صحیح یہ ہوا کہ مسرت کی مقدار کم ہو تو ہو مگر اس کی نوعیت و کیفیت اچھی ہو۔ نہایت ہی اچھی نوعیت کی خوشی ایک لمحہ کے لیے ملتی ہے تو لے لو۔ بُری قسم کی خوشی ایک سال کے لیے میسر آتی ہے تو چھوڑ دو۔

خوشی کی نوعیت کا اب کیسے پتہ چلے؟ کیسے یقین آئے کہ فلاں عیش گو مقدار میں تھوڑا ہے مگر مقابلہٴ اعلیٰ قسم کا ہے؟ خود سٹوارٹ مل سے یہ سوال کیا گیا۔ اُس نے کہا میرے نزدیک اس کا جواب صرف ایک ہے۔ خوشی کے کوئی سے دو کاموں میں سے نوعیت میں اچھا وہ ہو گا جسے سب یا قریباً سب اچھا سمجھیں۔ بشرطیکہ وہ ان دونوں کو بھر پور دیکھ چکے ہوں، اور مجلسی دباؤ سے بے نیاز ہو کر اس کے بارے میں رائے دے رہے ہوں۔ اب اگر اُس کی راہ کٹھن بھی ہو گی تو میں اُسے اختیار کروں گا۔ مثلاً ایک بنیا کتا ہے کہ افسانہ نگاری میں کیا دھرا ہے۔

ایک پہلوان کا خیال ہے کہ شاعری کے مقابلہ میں کشتی لڑنے میں زیادہ مسرت اور زیادہ عیش ہے بل کتا ہے میں ان دونوں کی شہادت کو معتبر نہیں سمجھوں گا کیونکہ شاعری اور افسانہ نگاری کے عیش پتہ بصرہ کرنے کے لیے بنیا اور پہلوان کسی طرح بھی مزدوں اشخاص نہیں ہو سکتے۔

اب آگے بڑھے تو ایک زامعہ دل سے کہہ رہا تھا کہ ”شراب بُری چیز ہے۔“ پاس سے ایک رند خراباتی پکارا اٹھا ”ہائے کم بخت تو نے پی ہی نہیں۔“ اب دل کے تسلیم کرے گا؛ بات منقطع میں چل گئی۔ جہاں تک شراب کی تصدیق کوئی کا تعلق ہے کون ہے جو اردو اور فارسی شاعری کی شہا زین صفحہ ہستی سے مٹا سکے۔

در عہد تنگ دستی در بادہ کوش و مستی کیں کیمیائے مہنتی تاروں کند گدرا حافظ
اور اردو نے تو مہر لگادی کہ خواہ تصوف کے مسائل ہی بیان کیوں نہ کرنے ہوں۔ ساغر دینا کے بغیر بات نہیں بنتی۔

ہر چند ہوشاہدہ حق کی گفتگو بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کے بغیر خائب
سبحان اللہ بادہ و ساغر کے الفاظ میں کس قدر شیرینی ہے کہ ”غالب کے معصر“ یا ”ہندوستان کے رہنے والے“ کسی اور چیز کا نام تک سُنا گا ارا نہیں کتے بگہ ذرا آگے چل کر دیکھو۔ وہی انسان جس کا فتنہ یہ تھا کہ شراب ”قاروں کند گدرا“ وہ بوڑھا ہو کر ایک دوسرا ہی مشورہ دے رہا ہے۔

چوں پیر شدی حافظ از سیکھہ پروں آ زندگی و خراباتی در عہد شباب اولی
اب تم اس کا کونسا مشورہ قبول کرو گے؟ پہلا یا دوسرا؟ کیا دوسرا؟ کیوں؟ تم کہو گے ”اس نے یہ طویل تجربہ کے بعد کہا“ مگر شراب پر رائے رکھنے کے لئے ”پیری“ ہی کیوں مناسب سمجھی جائے؟ یہ عہد تو وہ ہے جب عہد شباب اور یوں کہو کہ زندگی کی ساری صلاحیتیں چھوڑ کر رخصت ہوتی ہیں اور تم جوان ہو۔ پھر بڑھاپے کی رائے کیوں قبول کرنے لگے؟

کیا دل نے نوعیتِ پیش کی تلاش کا یہ طریق مقرر کر کے ٹھوکر نہیں کھائی؟ ہمیش کی نوعیت؟ حکمت تو خوب تھا مگر وہ خوراس کی بلند یوں کا ساتھ نہ دے سکا۔

فلاسفہ کا ایک دوسرا گروہ اب کانٹ کی سرکردگی میں لگے بڑھنا ہے۔ کلیسائی مفکرین اس کے جلو میں نیک کے اجماع و لاکھوج نکلنے ہوئے وہ اس حلقہ مفکر تک پہنچے جہاں سے اس پہلے گروہ کے جلا افکار سیرابی حاصل کرتے تھے! انہوں نے کہا غلطی ذرات میں نہیں اصل میں ہے۔ دلائل کے درخت کی ٹہنیوں اور پتوں میں نہیں بلکہ جڑ میں ہے۔ یہ کہنا خوش نیکی یا بھلائی ہے، یہی بنیادی لغزش ہے۔ نیک عملی کی زندگی میں اکثر و بیشتر ایسے مواقع آجاتے ہیں جن کی راہ ماتم دکھ اور مصائب کے کانٹوں سے پڑھتی ہے۔ مثلاً حفظ وطن کے لیے غارتگری اور دم توڑنے کے سامنے جا رہا ہے۔ وقت کے جا بجا ہاتھ سجھنے والی زبان کو گدی سے کھینچا رہا ہے۔ گونگی کی راہ چلنے والوں کو بعض اوقات خوشی بھی نصیب ہو جاتی ہے مگر نیکی اور خوشی لازم ملزوم نہیں۔ اس لیے خوشی کو بھلائی قرار دینا فیصلہ کی غلطی ہے۔

اجھا، مان لیا کہ خوشی نیکی نہیں ہے۔ پھر نیکی آخو ہے کیا چیز؟ پھیلین، کانٹ اور اس کے پیروا جواب دیتے ہیں "وہ ایک فصل ہے جس میں خود اپنا سُن ہوتا ہے"۔ ہمیں اسے کیوں اختیار کرنا چاہیے؟ وہ کہتے ہیں "نیکی کو ہمیں اُس کے اپنے حُسن کے لیے اختیار کرنا چاہیے"۔ صداقت اور حُسن بذاتِ خود بھلے ہیں۔ زنا بذاتِ سُرِیائی ہے یعنی نیکی اپنے الگ وجود کے ساتھ قائم ہے۔ (OBJECTIVE EXISTENCE OF GOOD)۔ وہ محاسن کی ایک فہرست ہے۔ اخلاق کا ایک ضابطہ ہے جس پر ہمیں چلنا ہے عیش نہیں بلکہ یہ ضابطہ حیاتِ زندگی کا محور ہے۔ اس ضابطہ کی زندگی کو کانٹ (FORMALISM) کہتا ہے۔

کانٹ نے نیکی کا جو تصور ہمارے سامنے رکھا ہے۔ وہ اپنے اجمال میں یہ ہوا۔

(۱) نیکی کا ایک خارجی وجود ہے۔

(ب) خوشی اور نیکی لازم ملزوم نہیں۔ نیکی کو ہم اُس کے نیک وجود کے لئے پسند کرتے ہیں، خوشی

کی غرض سے نہیں کرتے۔

نیکی کا اگر کوئی ایسا خارجی و معروضی ضابطہ ہے جسے انسانی فطرت تعمیر نہیں کرتی اور جس کی پیروی میں بھی لازم نہیں کہ انسان کو خوشی نصیب ہو، تو پھر اس کا مُصنّف کون ہے؟ ماضی یا حال کے انسانی تجربات کو اگر اس کا مُصنّف کہا گیا تو یہ انسان کا ایک ذاتی و داخلی فعل ہو جائے گا۔ خارجی و معروضی درجے کا مفکرین کی پہلی جماعت نے بھی تو یہی کہا تھا۔ انہوں نے بھی تو خود انسان کے اندر پیدا ہونے والے ایک جذبہ باروشنی کو اس کے لئے کافی سمجھا تھا۔ اب دونوں میں اختلاف کو نساہ گریا ہے کیا صرف یہی کہ محصلین کے پہلے گروہ نے انسان کے دو اصولی جذبات غم اور خوشی میں سے خوشی کو اپنی جانوں کے لیے بہتر سمجھا ہے کیا وہ غم اور دکھ کو انتخاب کرتے؟ وہ ایسا کیوں کرتے؟ انسان نے اپنی ساری سرگزشت میں کہیں بھی اور کبھی بھی تو ایسا نہیں کیا۔

یہ استدلال ایک دوسرے گوشے کو بھی بے نقاب کر رہا ہے۔ وہ یہ کہ غم کو انسان طبعاً پسند نہیں کرتا، وہ گئی خوشی تو خوشی کا انتخاب کانٹ کی نگاہ میں بُرائی ہے یعنی انسان کو اس کی جبلت نہیں چھوڑا جاسکتا، اس کی فطری روشنی پر اکتفا نہیں کیا جاسکتا۔

کلیسا ئی مفکرین بھی اس کے ساتھ آواز ملاتے ہیں کہ ہاں نہیں کیا جاسکتا۔ یہ اس لیے کہ وہ انسانی فطرت کو اکتفا کی نگاہ سے نہیں دیکھتے۔ ان کا خیال ہے کہ انسان کی سرشت میں گناہ ہے۔ سولہویں صدی مسیحی تک ان کی تبلیغی سرگرمیوں کا صرف یہی ایک تعلیم کر زبانی رہی سینٹ پال کی طرف جو انبیت مسیح کی تعلیم فسوب کی جاتی ہے اس کی تمام تہ بنیاد صرف اسی ایک خیال پر رکھی گئی تھی۔ اس کلیسا ئی تعلیم کے نفوذ کا یہ عالم ہے کہ بل و خوشی کے فلسفہ کا داعی، جب خوشی میں "نوعیت" کا عنصر پیدا کرنا چاہتا ہے تو اسے انسانی فطرت میں کوئی صلاحیت نظر نہیں آتی۔ وہ بھی انسانی سرشت کے گناہ سے اس درجہ خائف ہے کہ وہ یہ نہ کہہ سکے کہ انسان خود اپنی فطرت کی پیروی

کہتے ہوئے بھی بھلائی کو پہنچ سکتا ہے۔ چنانچہ وہ دلائل کے مواخذہ سے دامن بچا کر گزرا ہوا ہوتا ہے۔ اور صرف یہ کہہ کر خاموش ہو جاتا ہے کہ

MANY STOIC AS WELL AS CHRISTIAN ELEMENTS

SHOULD BE INTRODUCED IN MORALITY

”ہمیں اخلاقیات میں رومانی اور عیسائی عناصر کو شامل کر لینا چاہیے“

ظاہر ہے کہ یہ الفاظ اس کی معذوری کے آئینہ دار ہیں۔ یہاں دلیل اس کی معاونت نہیں کہہ رہی ہے۔

کلیسا نے الہام کو نیکی کا خارجی مصنف کہا اور اسلام میں الہام کا تصور بالکل جداگانہ ہے اور وہ اپنے مقام پر بسط سے آئے گا، اور اس سے نیکی کا یہ معروضی تصور قائم ہوا۔ مگنا اس تصور کو سترھویں صدی مسیحی میں ایک آخری مملک ضرب پہنچی عیسائی مشنریں نے دور دست جزائر میں سفر کیے۔ زمین کے ایسے کونوں تک پہنچے جہاں انہیں مسیح اور کفارہ کی کوئی آواز نہ پہنچی تھی۔ وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ وہاں کے بسنے والے اخلاق کے نہایت بلند اصول پر کار بند تھے۔ آخر کار ان ہی سیاحتوں کی بدولت ”رنیک سیرت وحشی“ (VIRTUOUS SAVAGE) کی ندرت کی اصطلاحات وضع ہوئیں۔

فصیلہ طلب امر اب صرف یہ رہ گیا کہ فطرت انسانیہ کا مطالعہ کرتے ہوئے خوشی کے مصنفین نے ٹھوکر کہاں کھاٹی اور حقیقت کہاں چھپی ہے؟

۷

جب نباتات اور حیوانات اپنی فطری استعداد کی حدود میں نہایت صلاحیت کے ساتھ زندگی بسر کر رہے ہیں اور انہیں کسی بیرونی یا انسانی ضابطہ اخلاق کی ضرورت پیش نہیں آتی تو پھر کیا یہ صرف انسان ہی ہے جس کے لیے اس کی اپنی فطرت میں کوئی راہنمائی موجود نہیں؟ یقیناً انسان نہیں بلکہ جمادات

کی کوئی لائینئی شکل ہوگی جس کی زندگی کی معنائیں تم اس کی اپنی فطرت کے ہاتھوں میں دیتے ہوئے گھبراتے ہو۔ انسانی اخلاق کا اصل کار یا مذہب عمل و دوسری جملہ مخلوقات کی طرح اس کی اپنی سرشت ہی میں تلاش کرنا چاہیے۔ اسپیکورس کے نظریہ یعنی نیکی کے موضوعی شکل میں صحیح صفت اس قدر ہے کہ تلاش صحیح گوشتہ میں کی گئی یگر خامی یہ رہی کہ تلاش کے صرف چند قدم اٹھا کر ڈھونڈنے والوں نے دم ہار دیا جو نشان منزل تھا اُسے وہ منزل سمجھے اور پھر وہیں بیٹھ گئے۔ وہ معلوم نہ کر سکے کہ اس کی تفصیل سے روشنی آگے بڑھتی ہے۔ چنانچہ ضابطہ کے مفکرین (FORMALISTS) نے زندگی کے شواہد سے یہ ثابت کر دیا کہ کوئی ایک شخص ہو یا ایک پوری جماعت عیش طلبی کے جذبات میں گم ہو کر پرنپ نہیں سکتی۔ اس کی زندگی میں بناوکی حکمہ بگاڑ کے آثار ابھر کر سامنے آجائیں گے تعمیر قیام اور صلاح کی لطف اندوزیوں کی بجائے زوال، فساد اور فنا سے دوچار ہونا پڑے گا۔

مدنیت کی پہلی اینٹ مان ہے۔ انسانی تمدن کی اس سے زیادہ ابتدائی کوئی صورت ذہن میں نہیں آسکے گی کہ کسی جنگل کے ایک گوشے میں ایک ماں ہو اور اس کی گود میں ایک بچہ ہو جسے وہ جنگل کے وحشی دزدوں سے چھپائے پھرتی ہو۔ حفظ نسل کا یہ پہلا درس ہے جو بچے نے ماں کی گود سے سیکھا۔

عقاب کو بچوں پر لپکتے دیکھ کر ماں نے انہیں سینہ سے چسایا۔ اور بچہ ظلم کی جا بھارتوں کو روکنے کے لیے اس نے اپنے کمر اور اترناواں بازوؤں کو پھیلا دیا۔ یہ تو اکثر ہوتا رہا کہ حملہ آور نے اُسے حملہ ختم پہنچائے مگر کبھی نہ ہوا کہ ماں نے بچوں کو بچانے کے لئے خود موت کے منہ میں جانا قبول نہ کر لیا نہ نسل کو بچانے کے لیے خود اپنی جان پر کھیل جانے کا یہ دوسرا سبق بھی انسان کو ماں کی گود نے دیا۔

چنانچہ یہ جوان بچہ جو اس نے اسی آئین پر اپنی ماں اور بہن بھائیوں کی نگہداشت کی۔

۱، انسان جب اپنے اعمال کو دیکھتا ہے کہ وہ اس کے قیام و بقا کا باعث ثابت ہو رہے

ہیں تو اس کے دل و دماغ جس جذبہ سے اپنی پسندیدگی کا اظہار کرتے ہیں وہ خوشی ہے۔ خوشی پھر فعل نہیں فعل کا نتیجہ ہوئی۔

۲۲) اور جب اُسے یہ نظر آتا ہے کہ اُس کے اعمال اس کے بہن بھائیوں اور دوسرے افراد کے لیے باعثِ صلاح اور باعثِ نیامِ ثابت ہو رہے ہیں تو وہ انہیں اور بھی زیادہ پسندیدگی سے دیکھتا ہے۔ منت کا یہ دوسرا بلند تر درجہ ہے۔

اور اس دوسرے مقام پر کنارا دہرنے اُسے یہ درس دیا ہے کہ جو بڑے گناہے اور پھر خوش ہو۔ صبح و شام کی محنت، شاقہ اور میدانِ جنگ میں خون کے چھینٹے ان سب میں خوشی کے چشے اُبل رہے ہیں۔ مسٹر چرچل برطانیہ کے وزیرِ اعظم نے ابھی کل ہی کہا کہ ہم اپنے بچوں کے لیے لڑ رہے ہیں جفظِ نفس کی اسی خواہش بلکہ ضرورت نے اعمال کی لمبی تاریخ مرتب کر دی۔ اور وہ قبیلہ، ملک اور قوم کے مدارج تک پہنچی۔ قرآن نے اسے ملک اور قوم کی حدود سے اچھا لالا اور وہ انسانیت کی بیکاریوں تک نہ گھسی

لے فاصلہ مقلدِ گار کے بیان سے ایسا مترشح ہوتا ہے کہ جفظِ نفس اور جفظِ نفع کا جذبہ جو حیوان اور انسان کی جبلت میں ولایت کیا ہوتا ہے وہی قانونِ صلاح و فساد کا سدا رہا ہے اور قرآن نے اسی پر اپنے اخلاقیات کی بنیاد رکھی ہے۔ اگر ان کا خیال ہی ہے تو کیسی طرح صحیح نہیں۔ یہ دراصل مخفی اہلِ فکر کی بنیادی غلطیوں میں سے ایک ہے کہ وہ انسان کو حیوان سے زیادہ کچھ نہیں سمجھتے اور اسی لیے انسان کے مذہبِ عمل کے مبادی حیوانی زندگی کے قوانین میں تلاش کرتے ہیں۔ حالانکہ انسان من حیثِ الانسان ہرگز حیوان نہیں ہے۔ اس کو آواز و ساری کے طور پر حیوانی جسم ضرور دیا گیا ہے، لیکن وہ بجاے خود حیوان نہیں۔ اگر وہ حیوان ہوتا تو سر سے اخلاق کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا۔ اخلاق کا سوال صرف اختیار (FREE - WILL) کے ساتھ پیدا ہوتا ہے حیوان، ہمارے نبات و غیرہ ذی اختیار مخلوق نہیں ہیں بلکہ قیام میں طبعی سے کلیتہً مقدر ہیں اور ان کا بناؤ اور بگاڑ ایسی قوتوں کے عمل سے ہو رہا ہے جن میں وہ اپنا آزادانہ انتخاب کہیں استعمال نہیں کرتے، اس لیے وہ اخلاقی وجود نہیں ہیں۔ بگس اس کے انسان کو ایک خاص حد کے اندر اختیار دیا گیا ہے اور اس کے صلاح و فساد کا سرشتہ تمام تر طبیعت کی جاہر قوتوں ہی کے ہاتھ میں نہیں ہے بلکہ بڑی حد تک اس کے اپنے آزادانہ انتخاب پر منحصر ہے اس لیے وہ ایک اخلاقی وجود ہے اور اس (باقی صفحہ ۳۵۹)

ہر وہ فعل جس کا رخ انسانی صلاح و فلاح کی طرف ہو وہ اچھا ہے، خیر اور نیک ہے، اور وہی حقیقی خوشی کا باعث بھی ہے۔ اور ہر وہ فعل جس کا رخ تعمیر کی بجائے تخریب، قیام حیات کی بجائے فنا اور صلاح کی بجائے فساد کی طرف ہو جائے وہ بُرا ہے، بدی اور شر ہے، اور وہی باعث غم بھی ہے۔

انسان کے تجربات کی بہت لمبی فہرست اس زمین کے کونوں میں پھیلی ہوئی ہے۔ قرآن کتنا ہے، کہ انسان اس لمبی زندگی میں فعل کو آزا چکا ہے۔ ہر لغزش کی سزا اور ہر استناری کا انعام حاصل کر چکا ہے

دلیلیہ حاشیہ از صفحہ ۳۵۸، بنا پر اس کی حیثیت تمام مخلوقات سے بالکل مختلف ہو جاتی ہے۔ قرآن سب سے پہلے انسان کی اسی امتیازی حیثیت کو نمایاں کرتا ہے۔ پھر وہ انسان کو بتاتا ہے کہ تیری فلاح اور تیرا خسران تیرا بنا اور گونا منحصر ہے اس پر کہ تو اپنے اس اختیار کو کس طرح استعمال کرتا ہے۔ اس کے بعد وہ انسانی سعی کے دور استوں کو واضح اور روشن فرق کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ ایک یہ کہ آدمی اپنی مختاری سے دھوکا کھا کر اپنے آپ کو خود مختار و غیر ذمہ دار سمجھ لے اور اپنی حیوانی جبلت کو اپنا پیشوا اور رہنما بنا کر اس کے پیچھے چلنے لگے، اور محض قوانین طبیعی (PHYSICAL LAWS) سے اپنی زندگی کا ضابطہ اخذ کر کے صرف اس دنیا کی کامیابیوں کے لیے اپنی مساعی وقف کر دے۔ یہ روشن چونکہ فطرت کائنات اور فطرت انسانی دونوں کے خلاف ہے، انہاں کائنات کا نظام اس طور پر بنا ہے کہ یہاں کسی کو خود مختاری کا حق ہو اور نہ انسان کی فطرت اس طور پر بنی ہے کہ وہ نرا حیوان بن کر محض تفریح و تہنیں پر چلے اس لیے اس کا آخری نتیجہ فساد ہے، بگڑنا اور ٹوٹ جانا ہے، تباہی و خسران ہے۔ دوسرا راستہ یہ ہے کہ انسان اس کائنات کے حکمراں اور خود اپنے صالح کو اپنا حکمراں سمجھے، اور اس کے دینے ہوئے اخلاقی قانون (MORAL LAW) کی پیروی کرے اور اس کے سامنے اپنی جواب دہی کا خیال رکھ کر اس کی رضا کے لیے سعی کرے۔ یہ روشن چونکہ فطرت کائنات اور فطرت انسانی کے مطابق ہے اس لیے اس کا آخری نتیجہ صلاح ہے، بنا اور ترقی کرنا ہے، فزا اور فلاح ہے۔ فاما من طغى و اثاره المجدوة الدنيا فان العجيبه هي المادى - واما من خاف مقامه صابه ونهى النفس عن الهوى فان المجدوة هي المادى - ترجمان القرآن

لے ترجمان القرآن۔ یہ بات اصل حقیقت کے برعکس ہے۔ دراصل خیر وہ ہے جو انسان کے بنانے والے کے منشاء کے مطابق ہو اور اس کا نتیجہ صلاح ہے، اور شر وہ ہے جو اس کے منشاء کے خلاف ہو اور اس کا نتیجہ فساد ہے۔

پھر ان وارداتِ حیات کو آنکھ کھول کر دیکھو اور پھر انہی زلات کا ارتکاب نہ کرو۔ قرآن کا عمرانی پیغام وسیع معنوں میں تاریخی استنباط کا پیغام ہے۔

انسان کی رہنمائی کا سارا بوجھ اس کی اپنی فطرت پر ہے۔ یہ تو ہوتا رہا کہ انسان نے ہر لغزش پر بہت بڑی انفرادی اور اجتماعی عقوبتیں برداشت کیں۔ مگر یہ کبھی نہ ہو کہ نوع انسان کا پورا کاروبار حیات کسی لغزش کی ایسی گھاٹی میں کھوجانا کہ مدت جاتا۔ اس کی زندگی راہ کے ہیچ و نم کوٹے کرتی ہوئی برابر بڑھتی آ رہی ہے اور ارتقائی منازل کا عزم کیے ہوئے ہے۔

وقت آگیا ہے کہ تمہیں بتادیں کہ غرضی کا مسکن کہاں ہے۔ تم اُسے ڈھونڈ رہے تھے۔ وہ اُن اعمال کا نتیجہ ہے جو موجب صلاح ہوں۔ اُن کو معلوم کر لو۔ اُسے پا لو گے۔ ان اعمال کو انسان کے خود اپنے تجربات کی تائید حاصل ہے۔ نیکی انسان کا داخلی اور موضوعی رحمان ہے۔ یہ کوئی موردِ محبت کی چیز نہیں کہ تمہیں اس کی تلاش کے لئے کہیں باہر مقرر کرنا پڑے۔

قرآن انسان کی فطرت کو کامل اعتماد اور بھروسہ کی نظر سے دیکھتا ہے :-

فَأَنفَخْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا فِطْرَةَ اللَّهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيلَ لِ

يَخْلُقِ اللَّهُ ذَٰلِكَ الدِّينَ الْقَيِّمُ ۚ وَكَذَٰلِكَ أَكْثَرُ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ۗ (مروم - ۳۰)

”پھر تو کھینچ کر اپنے آپ کو دین پر جمادے، اللہ کی فطرت (ساخت) پر قائم ہو جا میں پر اسے انسانوں کو پیدا

کیا ہے، اللہ کی بنائی ہوئی ساخت میں کوئی تبدیلی ممکن نہیں۔ یہی سیدھی روش ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے“

دیکھو مطالب سے کٹ کر صرف اس مقام کو درج کرنے کی ضرورت ہے۔ قرآن حکیم امور ذیل کی فطرت انسان کو متوجہ کرتا ہے :-

۱۱، ایک مقرر دین (راہ) پر آ جاؤ۔

لہ ترجمان القرآن۔ اس بیان میں بھی غلطی ہے اور اس کو ہم نے آگے ایک دوسرے حاشیہ میں واضح کر دیا ہے۔

(۲) وہی ایک راہ ہے جو انسان کی فطرت کی راہ ہے۔ انسان جاہلی اسی پرکتلہ ہے۔ یہ اس لیے کہ
وہیں بائیں متوجہ ہونا اُس کے لیے باعث ہلاکت ثابت ہوا، اور وہاں ہے اور ہوتا رہے گا۔

(۳) اسی پر انسان کی فطرت کو تعمیر کیا۔ یہ سیدھی راہ ہے۔ اُس کی ساخت کو اچھورا نہیں چھوڑا کہ وہ
کسی معروضی یا باہر کی ہدایت کا امیدوار رہے۔ اسی پر چلتے جانا بھلائی ہے۔

لئے ترجمان القرآن۔ فاضل مومن نگار نے یہاں سنڈل کانٹہ اٹا پھیر لیا ہے۔ اُنکے بیان کا ایسا سلوم ہونا ہے کہ فطرت کی راہ ایک ہی
بیچ ممکن اصل راہ اور سوج سے ہے کہ وہیں بائیں متوجہ ہونا توجہ پر ملک ثابت ہوا۔ حالانکہ دراصل اِس کے صحیح ہونے کی کوئی چیز نہیں ہے مگر
انسان ہلاکت میں مبتلا ہونے کی وجہ سے کہہ سکتا ہے۔ فاضل مومن کے طرز بیان آدمی کو یہ غلط فہمی لاسی ہو گئی ہے کہ قرآن نے اس
کو انسان کی تاریخی تجربات سے انداز کیا ہے یعنی ہزار ہا برس کے تجربات سے معلوم ہوا کہ انسان جب کبھی اسطرن یا اسطرن ہٹا ہلاک ہو گیا، لہذا
علم کی روشنی میں سن و فتنوں و فتنوں کے درمیان ایک بیچ کی راہ نکال لی جو سیدھی راہ صحیح ہے۔ ایسے کہ تاریخ کا تجربہ اسکو ایسا ہی ثابت
کرتا ہے۔ حالانکہ قرآن کا علم تجربات و مشاہدات سے انداز کیا ہوا علم نہیں ہے۔ علم کی یہ نوعیت انسان کے لیے نہیں ہے۔ قرآن کے مصنف
خداوند بزرگ کے علم کی یہ نوعیت نہیں ہے۔ اس نے تو انسان کو خود بنایا ہے۔ وہ اپنی ساخت کو اور اس کے مزاج کو بذات خود جانتا
ہے۔ اسی ذاتی علم کی بنا پر وہ صلح کے سبب کے ساتھ کہتا ہے کہ تو اس فطرت پر بنایا گیا ہے اور تیرے لیے یہ صحیح ہے۔ یہ وہ
شواہد قرآن میں انسانی تاریخ سے پیش کیے گئے ہیں تو وہ اس حقیقت سے نہیں ہیں کہ یہ وہ مواد ہے جس سے نیا تم کا اشتہا لگایا ہے
بلکہ نئے پیش کرنے کا وہ انسان کو یہ بتاتا ہے کہ خود اپنے تجربات کی کسوٹی پر اس راہ کو پرکھ کر دیکھو کہ اس پر پلٹا تیری زندگی کی اصل
سیدھی چلی اور جب کبھی تو اس سے ہٹاؤ مگر گئی۔ اُنکے چل کر دست در مقامات پر اس مومن میں ایسے فقرے ملتے ہیں جن سے تیرے
ہوتا ہے کہ قرآن اور نبی صرف تجربات سے حاصل شدہ علم کو پیش کرتے ہیں! ان تمام مقامات کی تصحیح کے لیے ترمیمہ کافی ہے۔

لئے ترجمان القرآن۔ یہ الفاظ پھر غلط فہمی پیدا کرنے والے ہیں! انسان کی فطرت میں اس کے خالق نے فخر اور تقویٰ کا وہ جانی
علم ضرور رکھ دیا ہے اور وہ فتنوں راہوں کو دیکھنے، سمجھنے اور پرکھنے کی استعداد ضرور ودیعت کی ہے، مگر حتیٰ و قطعی طور پر یہ جانتا کہ نبی
تقویٰ کی راہ ہے، یہی مقصد ہے فطرت ہے اور اسی میں خیر و صلاح ہے، تنہا انسانی فطرت کس کی بات نہیں ہے! انسان یہاں اپنے صلح
کی طرف توجہ کی محتاج ہے۔ اسکی طرف توجہ اور روشن رہنمائی کے بغیر وہ جسٹن اپنی فطرت کی رہبری میں اس راہ کا خود اکتفا نہیں کر سکتا
البتہ جب راہ سامنے پیش کوئی جاتی ہے تو فخر اور تقویٰ کا وہ وہ جانی علم جو اسکی فطرت میں موجود ہے، اُس کو خود اپنی گمشدہ چیز کو پہچاننے
میں مدد ضرور دے سکتا ہے، بشرطیکہ اکتسابی علوم کی بھرتی اور قصصیات و رجحانات نفس کی غلط افکار
نے اس و جہان کو سبک نہ کر دیا ہو۔

(۴) یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس سے تم میں سے اکثر واقف نہیں۔

اسی کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ”الْفَطْرَةُ“ کہا۔

ما من مولود الا يولد على الفطرة فابواه يهودانه او ينصرانه

”ہر بچہ ہونے والا اسی ایک فطرت پر پیدا کیا جاتا ہے جس پر اس کی ہدایت کا پورا بوجھ رکھا جاتا

ہے۔ یہ بچہ تم ہو کہ اُسے مختلف نام دے دیتے ہو۔“

(۵) یہی فطرت جس کے سہاے انسان زندگی کے لمبے سفر کو طے کرنے لگتا ہے یہ دینِ اہتمیم ہے۔ یہی

راہ ہے جو تمہیں قائم رکھتی ہے۔ مٹنے سے بچاتی ہے۔ ہلاکت سے بچاتی ہے اور قیام کی ضمانت ہے۔

۱۔ ترجمان القرآن۔ پہلا فقرہ ارشاد نبوی کے مطابق ہے، مگر بعد کے دونوں فقرے خود قائلِ مسلم کے

مدعا سے بہت دور ہٹ گئے ہیں۔ حضور نے نہ اس حدیث میں یہ فرمایا ہے اور نہ کبھی کسی موقع پر اپنے ایسا

کہا کہ ہر انسان کی اپنی فطرت ہی پر اس کی ”ہدایت کا پورا بوجھ“ رکھ دیا گیا ہے۔ اگر بات یہی ہوتی تو خدا

کی طرف سے الگ مستقل ہادی آنے کی ضرورت ہی کیا ہوتی۔ رہا تیسرا فقرہ تو وہ بھی حدیث کے مفہوم

سے پوری طرح مطابق نہیں ہے۔ حضور کا مدعا دراصل یہ تھا کہ ہر بچہ اُس صحیح فطرت پر پیدا ہوتا ہے جس پر

اللہ نے انسان کو بنایا ہے۔ لیکن جس سوسائٹی میں وہ آنکھیں کھولتا ہے وہ اگر فطرت کی مدد سے ہٹی ہوئی

ہو تو وہ اس بچے کو بھی اپنی غلط راہ پر لگا دیتی ہے۔

۲۔ ترجمان القرآن۔ عربی زبان میں قیام کا اصل مفہوم راستی دیکھی کی ضد ہے۔ دینِ قییم وہ راہ ہے جو

خود سیدھی اور مستقیم ہے، اور جو اپنے رہرو کی زندگی کو راستی پر قائم رکھنے والی اور کجی سے بچانے

والی ہے۔ مٹنے اور ہلاک ہونے سے بچنا اس راستی کو راست روی کا نتیجہ ضرور ہے مگر فی نفسہ مقصود

نہیں ہے۔ عموماً مغربی نظریات کے اثر سے بقا (SURVIVAL) اور تسلسل حیات

(CONTINUED EXISTENCE) کی اہمیت لوگوں کی نگاہوں میں زیادہ بگڑتی ہے

اس لیے وہ ”دینِ قییم“ کے لفظ میں جب قیام کا مادہ دیکھتے ہیں تو خواہ مخواہ ان کا ذہن بقا اور

انسان کس کے سہارے چلتا ہے؟ فطرت کے۔ فطرت کا طریق کار یا مذہب عمل کیا ہے؟ اصلاح و تعمیر۔ وہ دین القیم ہے۔ تمہاری زندگی کو قائم رکھنے والی راہ۔

قرآن ہمیں اپنے عمرانی پیغام کی صحیح معرفت عطا کرنے کے لیے ہماری حیات کے زمینی تجربات کو ہمارے سامنے پھیلاتا ہے۔ اور صرف ان اعمال کو جنہیں ہم نے خود دیکھا کہ وہ ہمیں گھلانے میں رکھتے چلے آئے ہیں وہ بدی کتنا ہے۔ ان کے برعکس وہ اعمال جو ہماری آنکھوں نے خود دیکھے کہ وہ آج تک اصلاح کا باعث بنتے چلے آئے ہیں، انہیں وہ نیکی یا بھلائی کتنا ہے۔ ہماری حیات ارضی کے لیے انہیں بہتر بتاتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ تم روزمرہ کے معاملات میں (۱) سچائی (۲) فیصلہ کن سچائی (۳) اطاعت رسول اور اطاعت الہی کو اختیار کرو۔

کیوں؟ اس لئے کہ صرف یہی اعمال (۱) تمہارے روزمرہ کے معاملات میں اصلاح اور بناؤ پیدا کر سکتے ہیں (۲) تم سے تمہاری برائیوں کو کاٹ کر الگ کر سکتے ہیں (۳) تمہیں کامیاب زندگی عطا کریں گے۔

اب ان مقامات کو سامنے رکھ کر سورہ احزاب پڑھو:-

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَتُؤَلُّوا قَوْلًا سَدِيدًا ۖ أَهْ بَصَلِحْ لَكُمْ

أَعْمَالُكُمْ وَيُغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ ۗ وَاللَّهُ وَرَسُولُهُ يُعْلَمُونَ قَوْلًا فَتَوَاضَعُ عَنِّي الْأَحْزَابُ (احزاب، ۶)

حق شناس آنکھیں رکھتے ہو تو دیکھو اطاعت خدا و رسول کو کبھی کسی عرفی جس (SUBJECTIVITY) کے

لیے قبول کر لینے کو نہیں کہا۔ بلکہ کہا تو یہ کہا کہ تم دیکھ چکے ہو کہ نینواری اصلاح کا باعث ہے۔

قرآن کتنا ہے:-

لے ترجمان القرآن۔ اس آیت کا مطلب نہیں ہے کہ اطاعت خدا و رسول اس لیے روزگرتجربے اس کا موجب ہونا ثابت ہوا ہے۔ بلکہ اس کا واضح مفہوم یہ ہے کہ ایسا کرو گے تو اللہ تمہارے اعمال کو درست کرے گا اور تمہیں کامیابی عطا کرے گا۔

آپس میں نہ جھجکرو۔ اس لیے نہیں کہ اس میں کوئی معروضی بدی ہے۔ بلکہ اس لیے کہ ایسا کرنے سے انسان کی زندگی قائم نہیں رہ سکتی۔ اس میں فساد اور ہلاکت آجاتی ہے۔ مٹنے والوں کے آثار باقیات سے پوچھ لو کہ ایسا کرنے سے تمہاری طاقت کسست پڑ جائے گی اور تمہاری ہوا اکٹھا کی جائے گی اس کے بجائے تم یہ کرو کہ

۱۱، اللہ اور اس کے رسول کے اطاعت گزار بن جاؤ۔

۲۱، صبر کرو یعنی مصائب کے مقابلہ میں عدم کے ساتھ کھڑے رہو اس لیے کہ بالآخر جیت اسی کی ہوگی جو زیادہ مشکلات بھیلنے والا ہوگا۔

اور یہ چیزیں کوئی نئی نہیں۔ انسان نے ان کو خود عملاً دریافت کیا ہے۔ یہ اُس کے اپنے دل کی آوازیں ہیں۔

وَاطِيعُوا اٰلِهَةَ دَرَسُوهُ وَلَا تَسْتَاذِرُوْا عَنْ قَتْلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ذٰلِكَ لَكُمْ وَاٰلِ اٰبَادِكُمْ اَلْمَلَاٰطَةُ اِنَّ اٰلِهَةَ
مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ؕ (الانفال - ۴۵)

۱۰، جو لوگ اللہ کے سامنے اس طرح کھڑے ہوتے ہیں جیسے وہ ایک باجبال بادشاہ کے حضور ہوں۔
۲، جو لوگ ہرگمی بات سے بچتے ہیں۔

۳، اپنی کمائی سے محتاجوں کو دیتے ہیں۔

۴، زنا سے الگ ہوتے ہیں۔

۵، امانتوں کی حفاظت کرنے ہیں۔

۶، وعدہ کے پکے ہوتے ہیں۔

ان کے کاموں میں بگاڑ یا فساد رہ نہیں پاتے۔ انسان کی ہستی کی یہ ایک آزمائی ہوئی حقیقت ہے۔ ایسے لوگ آج تک فلاح پانچکے ہیں اور آئندہ پانے رہیں گے۔

قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ ۝ الَّذِينَ هُمْ فِي صَلَاتِهِمْ خَاشِعُونَ ۝ وَالَّذِينَ هُمْ يَلْكُوْنَ
فَاعْلُوْنَ ۝ وَالَّذِينَ هُمْ يُعْرُوْهُمْ حَفِظُوْنَ ۝ إِلَّا عَلَىٰ أَزْوَاجِهِمْ مَا مَلَكَتْ
أَيْمَانُهُمْ فَإِنَّهُمْ غَيْرُ مَلْكُوْمِيْنَ ۝ (المؤمنون - ۱ تا ۴)

قد افلح - ماضی کا صیغہ یہاں خاص لطف دے رہا ہے۔

قرآن انسان کو اس کی لمبی سرگزشت کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ وہ تم سے پوچھتا ہے کہ کیا تم زمین کے احوال کو گھوم کر شاہدہ نہیں کرنے؟ اپنے پھلوں کے باقیات کو آنکھیں کھول کر نہیں دیکھتے؟ مٹنے والوں کے کھنڈرات سے جو صدائیں بلند ہو رہی ہیں کیا وہ تمہارے کانوں تک نہیں پہنچتیں؟ تمہارے سینوں کے اندر ولی تو صرف اس لیے دیئے گئے تھے کہ تم ان سے درس و عبرت کے خزانے جمع کر لیتے۔ ان کے تجربات سے فائدہ اٹھاتے۔ جس نوع کے اعمال ان کے لیے صلاح کا باعث ہوئے انہیں اختیار کر لیتے۔ جو انہیں ہلاکت کی طرف لے گئے ان سے بچ جاتے۔ وہ اگر انچی کوتاہیوں کی نذر ہو گئے تو تم ان سے عبرت حاصل کرتے۔ دیکھو تم بھی ان کی طرح خرابی کی آزمائی ہوئی راہوں کو نہ آزمائو۔ تمہارے ابا کی داستانِ حیات صدیوں پھیلی ہوئی ہے۔ پھر کیا تمہارے دل و دماغ نہیں کہ تم پھر انہی ہلاکتوں کو آزمانے جا رہے ہو۔ بس سمجھ جاؤ اور ان شاہراہوں کی طرف بڑھو جو تمہارے لیے بہتر اور نفع رسان ہیں یا دکھو اور وہ نتائج ہیں جنہیں تمہارے اجداد نے کئی ہزار برس میں مرتب کیا۔ وہ بھی کوئی تھوڑے دنوں کی فرصت میں ان نتائج پر نہیں پہنچے تھے۔ تمہاری گنتی کے ایک ہزار سال انسان کی مجموعی زندگی کے ارتقا میں ایک دن کی حیثیت رکھتے ہیں۔ پھر جو مجموعی نتائج انسان نے اس کاوش سے مرتب کیے ہیں تم ان سے فائدہ کیوں نہیں اٹھاتے۔

یہ نہ سمجھو کہ آج سے ایک ہزار سال پہلے کے انسان سے تمہارا کوئی رابطہ نہیں۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ جہاں تک انسانی حیات کی تعمیر اور انسانی فطرت کی رفتار کا تعلق ہے وہ ایک ہزار

سال تو ایک دن کے مانند ہیں یعنی اس کے ڈانٹے تمہاری زندگی سے اور تمہاری زندگی سے ایک ہزار سال کے بعد کے انسان کی زندگی سے اس طرح ملے ہوئے ہیں جیسے آج کا دن آنے والے اور گذرے ہوئے کل سے ملا ہوا ہے۔ پھر جیسے پیر کے نتائج سے نکل اور نکل کے نتائج سے جمعرات الگ نہیں اسی طرح تم انسانیت کے ماضی اور مستقبل کے درمیان کی ایک کڑی ہو۔ پھر کیا تمہارے پہلو میں نل نہیں کہ تم عبرت کے ذخائر جمع نہیں کر لیتے؟

شاید تمہارے کان نہیں جس وجہ سے تم نہیں سنتے۔ تمہارے پاؤں نہیں کہ تم زمین کے گوشوں میں سفر کو نکلنے اور اپنے لیے ان اعمال کی جو آغاز آفرینش سے حیاتِ انسانی کی اصلاح کرتے چلے آئے ہیں اور ان کی جو ریزا اول سے حیاتِ ارضی میں فساد پیدا کرنے چلے آئے ہیں، اپنی ترجمانی کے لیے ایک فہرست بنا

أَفَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَتَنُّوا لَهُمْ خَلْقَ فَلُوْنٍ يَّعْقِلُوْنَ بِهَا وَأَذَانٌ يَّسْمَعُوْنَ
بِهَا ۖ فَإِنَّهَا لَا تَعْمَى الْأَبْصَارُ وَلَكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِي فِي الصُّدُوْرِهِ ۚ
يَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ وَلَنْ يُخْلِقَ اللهُ وَّعْدَةً ط وَإِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ
كَأَنَّهُ سَنَةٌ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ۝ (الحج - ۴۵ - ۴۶)

”کیا یہ لوگ ملکوں میں چلے پھرے نہیں کہ ان کے دل اس قابل ہو جاتے کہ سمجھیں کہ ہمیں کبھی یا کان ہی کھل جاتے کہ حقیقت کی ترجمانی کرنے والے کی بات نہیں۔ دراصل آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں بلکہ وہ دل اندھے ہو جاتا کرتے ہیں جو سینوں کے اندر پوشیدہ ہیں۔ یہ لوگ تم سے عذاب کے مطالبہ میں جلدی بچا رہے ہیں۔ اللہ ہرگز اپنے وعدہ کے خلاف نہ کرے گا۔ مگر تیرے پروردگار کے ہاں ایک دن کی مقدار ایسی ہے جیسے تم لوگوں کی سنتی میں ایک ہزار برس“

اگر تم یہ عبرت اندوزی کی خواہش لے کر اپنے ماضی کے پاس جاؤ تو دیکھو گے کہ نسلِ انسانی کو نبیوں کی دعوت سے ہمیشہ فائدہ ہی پہنچا۔ انہوں نے ہمیشہ تمہاری مردہ روحوں کو زندہ کیا۔ تمہیں بھی ان کی دعوت

سے زندگی حاصل کرو۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَابْتَغُوا الْوَسِيلَ إِذَا عَادَ كُفْرُكُمْ لَعَلَّكُمْ تُعْلَمُونَ (الانفال ۳۳)
 ”ایمان لانے والو! اللہ اور اس کے رسول کی پکار پر لبیک کہو جبکہ وہ تمہیں ایسی چیز کی طرف بلائے جو تم
 کو زندگی بخشے والی ہے۔“

جھٹلانے والے انہیں ہر عہد میں جھٹلاتے رہے۔ مگر ان کا انجام کیا ہوا؟ ہونا کہ نتائج نے نہیں
 آیا اور وہ تمہارے لیے دردناک داستانیں چھوڑ گئے۔ تم ان کی ٹوہ میں نکلو۔ قَدْ خَلَّكَ مِنْ قَبْلِكَ وَمَنْ مُسْتَنْ
 فَسِيرٌ وَإِنِّي الْأَرْضُ فَأَلْطَرُوكَ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمَلِكِ الَّذِينَ ه (ال عمران - ۱۳۶)

ایمان و تقویٰ (الانفال - ۲۸) فی سبیل اللہ خرچ کرنا (الانفال - ۶۰) عہد و پیمانہ کی پچی (الانفال)
 کی آخری آیات، ہدایت الہی کی پیروی (طہ - ۲۰) ان افعال کو تمہارے کچھپلوں نے اپنی زندگی کے سفر میں
 آزما دیکھا ہے کہ یہ باعث اصلاح ثابت ہوتے رہے۔ ان کے برعکس جو اعمال کسی زمانہ میں بھی تمہاری
 اصلاح نہ کر سکے بلکہ فساد کا باعث رہے وہ یہ ہیں۔

قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْأَخْسَرِينَ أَعْمَالًا الَّذِينَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا
 وَهُمْ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا أُولَئِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ
 وَلِقَائِهِمْ فَحَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فَلَا يَقِيمُونَ لَهُمْ لِقَاءَ رَبِّهِمْ وَلَا يَلْقَاوَنَّهُمْ صُنْعًا وَلَا رِزْقًا (المائدہ - ۲۰، ۲۱)

” ان سے کہو تم نہیں بتائیں کہ ان لوگ اپنے کاموں میں سب سے زیادہ نامراد ہیں؟ وہ جن
 کی ساری کوششیں دنیا کی زندگی میں کھوئی گئیں اور وہ اس دہوکے میں پڑے ہیں کہ بڑا اچھا
 کام بنا رہے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے پروردگار کے احکام و ہدایات کو زمانا اور اس
 سے انکار کیا کہ انہیں ایک روز اس کے حضور میں پیش ہونا ہے۔ اس لیے ان کے سب
 کام امارت گئے۔ اور اس لیے قیامت کے دن ہم ان کے اعمال کو کوئی وزن نہ دیں گے۔“

رسول کی سنتی اس سے زیادہ نہیں کہ وہ تمہیں ان زندگی کی آزمائی ہوئی راہوں سے آگاہ کرنے والا ایک انسان ہوتا ہے۔ تم پر واروغہ نہیں ہوتا۔ تمہیں جبراً کسی راہ پر لانے کا ذمہ دار نہیں ہوتا۔ وہ اپنے اور عجائب کاریاں لے کر تمہارے پاس نہیں آتا۔ وہ تمہاری طرح بازاروں میں مین دین کرنا ہے وہ تمہارا کفارہ ہو کر نہیں آتا۔ تم اس کی باتوں کو سننے میں اڑا دو، تم اس کی ہدایت کو قبول نہ کرو، وہ تمہارے قلوب، آنکھوں اور کانوں پر کوئی قبضہ نہیں رکھتا کہ بہروں کو سنا دے اور اندھوں کو دکھائے۔ یہ اس کے بس کی باتیں نہیں نہ یہ کام اس کے سپرد کیا گیا ہے۔ تمہاری طرح وہ بھی صرف اپنے اعمال کا ذمہ دار ہے۔

وَاِنَّ كَذَّبُوكَ نَقَلْنَا لِيَوْمَئِذٍ وَعَمَلِكُمْ ۚ اَنْتُمْ بِرَبِّكُمْ وَاِنَّا اَعْمَلُ وَاِنَّا بَرِيۡرٌ
وَمَا تَعْمَلُوْنَ ۚ وَ مِنْهُمْ مَنْ يَسْتَمِعُونَ اِلَيْكَ ۗ اَفَاَنْتَ تَسْمِعُ الصُّمَّ وَلَوْ كَانُوْا
لَا يَسْمَعُوْنَ ۚ وَ مِنْهُمْ مَنْ يَنْظُرُ اِلَيْكَ ۗ اَفَاَنْتَ تَهْدِي الْعُمْىَ وَلَوْ كَانُوْا اَبْصَارًا ۚ وَ مِنْهُمْ

ان تجربات کو قرآن "نور" بھی کہتا ہے۔ دیکھو گے تو ان کی روشنی میں تمہاری زندگی کا پہلو واضح ہو جائے گا۔ انسان جو جبل و جذبات کے حالات سے ٹکراتا آگے بڑھ رہا ہے اور یہ اس کے اپنے قرب کردہ اصلاح کے اصول ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ اس زمین کی وراثت ان مصلحین کے لیے وقف ہے جو ان اصول

لے ترجمان القرآن۔ رسول کے منصب کی تعبیر صحیح نہیں۔ وہ تو روح یا محقق انسانیات (ANTHROPOLOGIST) نہیں ہوتا جس کا کام انسان پر گزری ہوئی کیفیات کا ماہرہ لینا اور لوگوں کو کھینچنے سونوں کی آزمائی ہوئی راہوں سے آگاہ کر دینا ہو۔ اس کا علم تجربات و مشاہدات اخذ کیا ہوا علم نہیں ہوتا بلکہ تحقیق کا علم ذاتی جو خالق کائنات کے پاس ہے وہ وحی کے ذریعہ سے براہ راست اس کے پاس آتا ہے۔ اور چونکہ وہ حقیقت تغیر کا علم ہوتا ہے اس لیے انسانی تجربات کی شہادت اس کی تائید کرتی ہے۔ لہٰذا ترجمان القرآن۔ قرآن ان تجربات کو نور نہیں کہتا بلکہ خدا کی طرف آئی ہوئی دانش و ہدایت کو نور کہتا ہے۔ ماسی طرح یہی صحیح نہیں کہ اصلاح کے جو اصول قرآن میں لکھے ہوئے ہیں وہ انسان کے اپنے قرب کردہ ہیں۔ بلکہ نور انسانیات کے مطالعہ و تحقیق سے معلومات کا جتنا ذخیرہ آج تک ہم ہوا ہے وہ سب اس سے لے کر کبھی انسان اپنی فلاح و سعادت کے صحیح اصول خود قرب نہ کر سکا +

کو پیش نظر رکھ کر زندگی کے سفر کو نکلیں اور حقیقت صرف تمہارے لیے نہیں بلکہ زبور میں بھی ہم نے ہی کہا تھا یعنی یہ بہت پرانی حقیقت ہے۔ (الانبیاء ۱۰۴)

قرآن جب کسی برباد ہونے والی سببی یا قوم کا ذکر کر لے تو ہر موقع پر حقیقت دہرا دیتا ہے۔ کہ ہم کسی پر علم نہیں کرتے یعنی یہ جو اس سببی کو سزا دی گئی یہ کوئی معروفی واقعہ نہ تھا بلکہ انہوں نے خود علم کیا دوسرہ توہ ۶۹۔ یٰٰن کے اندر کے اعمال تھے۔ یہ ایک موضوعی واقعہ تھا۔

ایک پیورس نے خوشی کو ڈوبنا سببیتقم نے خوشی کی بہتات (QUANTITY) کی آرزو کی جان سٹوارٹ مل نے بہتر خوشی (QUALITY) پر زور دیا مگر کوئی بھی اس طرف نہ گیا کہ ان افعال کو تلاش کیا جائے جو خوشی پیدا کرتے ہیں۔ اگر یہ ہو سکتا کہ دوزخ کا تہ تو نہ ہو مگر اس کے ہرے بھرے پتے پھوٹ رہے ہوں تو پھر وہ خوشی کو تلاش کرنے والے ناکام نہ رہتے۔ غم اور خوشی تو تاثرات ہیں جو مختلف افعال کے نتائج ہوا کرتے ہیں۔

ایک کوئی بیورٹی کے اعلیٰ امتحانات میں کامیاب ہو کر خوشی مانتی ہے۔ ایک کو شراب کے جرعات میں۔ دونوں خوش ہیں۔ اب ایک میری شخص جو ان کو دیکھ رہا ہے چاہتا ہے کہ اُسے بھی خوشی حاصل ہو مگر وہ نہ تو امتحانات میں بیٹھنا چاہتا ہے اور نہ شراب کو خریدنے کے لیے دام رکھتا ہے۔ تو بتاؤ کیا خوشی کا حصول اس کے لیے ممکن ہے؟ خوشی تو محض ایک نتیجہ تھی پس تم کہو گے کہ وہ صحیح سوچ نہ سکا۔

خوشی کے تلاشیوں کے لیے صحیح طریقہ تو یہ تھا کہ وہ ایسے دوزخ کی جستجو کرتے جس کی ٹہنیوں میں خوشی کے پھول آتے ہوں۔ مگر وہ اُچھے رہے اور اس حقیقت کو نہ پاسکے۔

اب تم دیکھ چکے ہو کہ خوشی صرف اُن افعال سے پیدا ہوتی ہے جو حیات انسانہ کے لیے آج تک بناؤ سکا۔ کا ذریعہ ثابت ہوتے رہے ہیں۔ باعث صلاح رہے ہیں جن میں تباہی اور فساد کا اصل کوئی امکان نہیں ہے۔

۱۔ قرآن ماضی کو تمہارے سامنے رکھتا ہے۔

۲۔ تمہارے لیے ماضی نے جن امور کو باعث صلاح پایا انہیں شاکر کہتا ہے! اور انہیں اگر تم انہیں اختیار کر لو تو

ایک دائمی کامرانی کی بشارت دیتا ہے۔ زمین کو تمہاری وراثت بتاتا ہے۔ نبی کو وہ اسی لیے بشیر کہتے ہیں اس لیے کہ وہ بشارت دیتے ہیں۔ ان الأراضین یرثہا مبادی الصالحون (الانبیاء - ۱۰۷)

۳۔ اور وہ افعال خیر نہیں تم دیکھ چکے ہو کہ وہ مفاسد ہیں ان سے تمہیں خبر ہر نہنے کے لیے کہتا ہے تمہیں اچھے سواہر اٹانے ہوتے انجا موسیٰ ڈرتا ہے۔ نبی کو وہ اسی لیے نذیر کہتا ہے اس لیے کہ وہ ڈرتا ہے۔

۴۔ یہ مخصوص ہے کہ قرآن خود انسان کی فطرت کو اسکا رہنما بتاتا ہے۔ وہ اپنی اندرونی ہدایت زندگی کے سفر کو نکالے ہے۔

۵۔ تاریخ کی شہادت یہ ہے کہ انسان خوشی کی تلاش نہیں کرتا بلکہ اپنے قیام و صلاح کا طلبگار ہے خوشی اگر فساد و ہلاکت کا باعث ہو تو وہ اسے اختیار نہیں کرتا۔

کانٹ اس مٹائف (EPICUREANISM) کے مرض کے صحیح مقام پر انگلی نہر نہر رکھا۔ وہ یہ نہ سمجھا کہ اس پرچھا ہا کہاں رکھا جا سکتا ہے، فکر کی غلطی کیا ہے اور اچھی صحت کیسے کی جا سکتی ہے۔ لہذا وہ ایک دوسرے گوشے میں ٹکل گیا۔ وہ انسان کی فطرت کو مایوسی سے دیکھتا ہے۔ اس نے انسان سے الگ نیکی کا ایک نیا نظریہ مندرج کیا اور انسان کو کہا کہ وہ اسے قبول کر لے۔ اس نیکی کے معنی ہی نظریہ کی صحیح معرفت کے لیے ایک اندھے کو تصور کرو جو اپنی آنکھوں پر اعتبار نہیں کر سکتا اور ایک پتھلی بکرے سے باز کی بھیڑ سے گزر رہا ہے۔ اسی طرح یہ مرضی مصلحتیں انسانی فطرت پر اعتماد نہیں رکھتے۔ وہ انسان کے اندھے آنکھوں میں اپنا نظریہ مندرج کر کے زندگی کی تاریکیوں سے گزارنا چاہتے ہیں۔

غور کرو جب انسان فطرتاً اندھے ہے تو اسکی رہنمائی کیسی ہو تم نے کسی اندھے کو نہیں دیکھا کہ وہ بہرہ پر لاٹھی تھلے اسکے ساتھ جاتا تھا وہ دن کے چومیس گھنٹے اور گھنٹے کے ساتھ منٹ اور منٹ کے ساتھ سیکنڈ اسکے ساتھ رہ سکتا ہے۔ پھر اور کچھ جو آگ فطرتاً جلاتی ہے تم اسے جلانے سے روک نہیں سکتے۔ انسان اگر فطرتاً اندھے ہے تو تم کون ہو کہ اسے نظریہ مندرج کی لاٹھی دے کر اس کی فطری کوری کو دور کر سکو۔

نیکی کا یہ مرضی یا خیر خیر نہیں تھا، ظاہر ہے یہ استدلال کے مطابقت کا ساتھ نہیں دیتا۔